R. No. 2136/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

OK

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

Date
1-4-15-22

جلد ۲۶ - شمارہ ۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم جنوری ۱۹۶۷ء

اداریہ

نیا سال اور ایک سوال

ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو۔

نیا سال نئی امیدیں، نئے ارادے، نئے ولولے لاتا ہے۔ ہر شخص اس موقع پر پچھلے سال پر ایک تنقیدی نظر ڈالتا ہے، اپنی کچھ خوبیوں اور خامیوں کو دیکھتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ ان خامیوں کو دور کرسکے اور خوبیوں کو بڑھا سکے۔ کچھ لوگ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں، بیشتر کے لیے یہ شغل چند روز کے لیے ہوتا ہے اور پھر اس کی ضروریات کا جال انھیں الجھا لیتا ہے۔

قوموں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک روزمرہ زندگی کا دھارا ہوتا ہے اور اس کے مطالبے ہوتے ہیں۔ یہ مطالبے ادھر اُدھر دیکھنے، آگے کی سمت نظر کرنے یا مُڑ کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیتے مگر ایک سال گزرتے وقت یا کسی قومی تیوہار کے موقع پر، ذہن آگے یا پیچھے جاتا ہے۔ اس وقت قومیں بھی اپنا جائزہ لیتی ہیں۔ جن میں اپنا احتساب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ ماضی کی غلطیوں سے بچتی ہیں ورنہ روزمرہ زندگی کا دھارا انھیں بھی نگل لیتا ہے۔ ہر قوم کا فرض ہے کہ وہ روزمرہ زندگی کے دھارے کا شکار نہ ہو، زندگی کی منزلِ مقصود پر نظر رکھے، اپنے نصب العین کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دے، اپنے اصولوں سے کسی حال میں دست بردار نہ ہو۔

ہندستان کی آزادی کو ساڑھے انیس سال کے قریب ہوگئے۔ افراد کی زندگی میں یہ بہت بڑی مدت ہے۔ قوموں کی زندگی میں تھوڑا سا وقفہ ہے لیکن ایمانداری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عرصے میں ہم اپنی آزادی کی حفاظت کرنے میں، آزاد مردوں کی نظر پیدا کرنے میں، اس آزادی کی ذمے داریوں کو برتنے میں، قوم کو اس کی منزل کی طرف لے جانے میں، جمہوریت کے استحکام میں، سیکولرزم کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے میں، سوشلزم کی طرف گامزن ہونے میں بہت سست رفتار رہے ہیں۔ ہم نے اقتدار حاصل کرنے کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ قومی احساس، دیانت، فرض شناسی، وفاداری، خدمت، محنت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف جلسوں میں برتنے کے لیے ہیں۔ فروری میں ہمارا چوتھا عام انتخاب ہونے والا ہے۔ انتخاب سے ملک کی تقدیر نہیں بدلے گی۔ اندیشہ ہے کہ وہی کھچڑ پھر چلے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ووٹر اپنا فرض پہچانے، یہ دیکھے کہ وہ جمہوریت کو کمزور تو نہیں کر رہا ہے، سیکولرزم کو ضرب تو نہیں لگا رہا ہے، صلاحیت اور استعداد کا خون تو نہیں کر رہا ہے، مذہب، ذات، علاقے، زبان کو بے جا اہمیت تو نہیں دے رہا ہے۔ اگر ووٹر اپنا فرض پہچانے تو گندم نما جو فروش سیاست دانوں کو اپنی دکان چمکانے کا موقع نہ ملے اور اہلیت، صلاحیت اور دیانت رکھنے والے اشخاص اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جائیں۔

مگر عام چناؤ اہم ہوتے ہوئے بھی بہت اہم نہیں ہے۔ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو دھوکا دینا چھوڑ دیں اور دو رنگی ترک کر دیں۔ جو ہمارے فرائض ہیں ادا کریں تاکہ ہمارے جو حقوق ہیں ان پر اصرار بھی کر سکیں۔ یعنی اپنے اپنے دائرے میں اپنا کام ایمانداری سے انجام دیں، دوسروں کی سستی، غفلت یا بے ایمانی کو بہانہ بنا کر خود اپنے فرض سے غافل نہ ہوں۔ حوض میں دودھ کے بجائے پانی اس امید میں نہ ڈالیں کہ دودھ دوسرے تو ضرور ہی ڈالیں گے اور ایک لوٹا پانی معلوم ہی نہ ہوگا۔ آج ہمارے حوض میں پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ دوسروں سے ضبط و نظم کی توقع رکھنا اور خود ہر معاملے میں غیر ذمے دار ہونا ہمارا دوسرا مرض ہے۔ اس معاملے میں ہمیں اپنے گریبان میں منھ ڈالنا ہے اور وہی کرنا ہے جس کی توقع ہم دوسروں سے رکھتے ہیں۔ پھر ہمیں کچھ صبر کی عادت بھی ڈالنی ہے۔ ہمارا ملک بڑا ہے، اس کے مسائل بھی بڑے اور پیچیدہ ہیں، کسی جادو کی چھڑی یا علاء الدین کے چراغ سے حل نہیں ہو سکتے۔ انھیں آہستہ آہستہ صبر کے اور مسلسل کوشش سے حل کرنا ہے اور اس کے ساتھ نئے نئے مسائل کا بھی سامنا کرنا ہے چونکہ ہم ازمنہ وسطیٰ کے ذہن کی مدد سے جدید دور کے مسائل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم آج ازمنہ وسطیٰ میں نہیں گو اس کے اچھے پہلوؤں کی قدر کرتے ہیں۔ ہم بیسویں صدی میں، مشین کے دور میں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے عہد میں، راکٹ اور ایٹم بم کے عہد میں، تیسری جنگ عظیم کے خطرے اور امن عالم کی جدوجہد کے سائے میں جی رہے ہیں۔ اس کی روشنی میں ہمیں اپنا لائحہ عمل بنانا ہے۔ اس سال ہم میں سے ہر ایک کو اپنے سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اپنے علاوہ ہم ملک و قوم کے لیے اور انسانیت کی فلاح کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ سال کے دوران اس کا کیا جواب ملتا ہے۔

وشو بھارتی میں اُردو

شانتی نکیتن۔ بنجانی رابندر ناتھ ٹیگور کی قائم کی ہوئی یونیورسٹی وشو بھارتی کے وائس چانسلر ڈاکٹر کالی داس بھٹاچاریہ نے یہاں سالانہ کانووکیشن میں بتایا کہ یونیورسٹی چھٹے پانچ سالہ مدت کے دوران ہندوستانی زبانوں میں اردو شامل اور تیلگو نیز روسی زبان کے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ (سیاست، کانپور)

برطانیہ کے انگریزی روزنامہ میں اردو کا صفحہ چھپنا شروع ہوگیا

پہلے کتابت ہوجاتی ہے پھر اس کا بلاک بنا کر طباعت کی جاتی ہے

لندن۔ برطانیہ کے شام کو چھپنے والے اخبار بریڈ فورڈ ٹیلی گراف نے ایک صفحہ اردو میں چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بریڈ فورڈ میں رہنے والے ۲۵ ہزار ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو اخباری سہولتیں فراہم کی جائیں اس صفحہ پر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے گھریلو معاملات کے بارے میں مشورے دیے جاتے ہیں اس کے علاوہ مذہبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں اور تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ (سیاست، کانپور)

پاسترناک کے تراجم کا مجموعہ

ماسکو (تاس) مشہور سوویت شاعر بورس پاسترناک (۱۸۹۰ء-۱۹۶۰ء) کے جو تراجم کیے ہیں ان پر مشتمل ایک کتاب "تاروں بھرا آسمان" کے نام سے ماسکو میں شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شیکسپیئر، بائرن، کیٹس، شیلی، ورلین، گوئٹے، رلکے اور ٹیگور کی تخلیقات کے تراجم شامل ہیں۔

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے "رفتار" کا اجرا

علی گڑھ۔ ۱۵ دسمبر۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ماہوار "رفتار" کا اجرا اس ماہ سے ہوا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی زیر نگرانی شائع ہونے والے اس بلیٹن میں شعبہ کی تحقیقی، علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی روداد کے علاوہ شعبہ کے اساتذہ کی علمی مصروفیات کا جائزہ بھی شامل ہے پہلے شمارے میں مغربی تنقید کی بعض اصطلاحات کے اردو مترادفات اور ترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں تاکہ اصطلاحات میں ایک معیار اور یکسانیت ہو۔

(نامہ نگار ہماری زبان)

آگرہ میں قدیم قانونی دستاویزات کی نمائش کا افتتاح

آگرہ۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر نصیر اللہ بیگ نے یہاں قدیم قانونی دستاویزات کی ایک نمائش کا افتتاح کیا۔ آگرہ کے ضلع و سیشن جج نے جلسہ کی صدارت کی ۱۶۶۶ء کا ایک نکاح نامہ جو خواجہ رحیم اللہ ولد خواجہ امان اللہ خاں اور مسماۃ عبد النساء دختر مرزا مغل بیگ کی شادی کا تھا وہ نمائش میں شامل تھا۔ قدیم ترین تحریری دستاویز جو اس نمائش میں رکھی گئی تھی ۱۶۳۲ء کی تھی۔ ۱۰۰ء کی ایک دستاویز برج بھاشا کی اس میں رکھی گئی تھی۔ (الجمعیۃ دہلی)

سمرقند میوزیم میں کندہ مشہور شاہنامہ ایران ملا

ماسکو۔ اخبار "ازویستیا" کا بیان ہے کہ سمرقند کے مردہ عجائب گھر کے گودام میں فردوسی کی رزمیہ نظم "شاہنامہ ایران" پر کندہ تصویروں کی صورت ملی گئی ہے۔ یہ کندہ کاری گیارہویں صدی عیسوی کی ہے اور ایک ظرف کے ڈھکن پر نظر آئی ہے۔ (سیاست، کانپور)

ادارۂ فکر و فن۔ الہ آباد

الہ آباد میں نئی نسل کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کے اشتراک سے ادارۂ فکر و فن کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اردو زبان کی خدمت اس کی ترقی کے لیے جد و جہد اور نئی نسل نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ادبی، فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ان کی مدد کرنا۔ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ، بی۔اے، اور جامعہ اردو علی گڑھ و دوسرے اردو اداروں کے امتحانات میں شریک ہونے والے طلبہ کی مدد کرنا ہے۔

(منجانب شعبۂ نشر و اشاعت ادارۂ فکر و فن الہ آباد)

سوویت ماہر علم الہند کے سو ویں جنم دن کی تقریب

سوویت یونین کی سائنس اکاڈمی کے ایشیا انسٹی ٹیوٹ کا ایک جلسہ ممتاز سوویت مستشرق اکادمیشین فیودور شیرباتسکی کے سو ویں جنم دن کی تقریب کے سلسلہ میں منعقد ہوا۔ اکادمیشین شیرباتسکی زندگی بھر ہندوستانی فلسفہ اور بدھ مت کا مطالعہ کرتے رہے۔ بدھ مت کے تعلق سے انہیں سوویت یونین اور غیر ملکوں میں بے مثال ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء میں "بودھی منطق" کے عنوان سے ان کی ایک کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

روس کی پندرہ زبانوں میں ۶۵۹۵ اخبارات شائع ہوتے ہیں

ہلسنکی۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق روس کے اندر پندرہ زبانوں میں اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۶۵۹۵ ہے۔ اس میں صرف روسی زبان کے اخباروں کی تعداد ۴۰۰۵ ہے جن کی مجموعی اشاعت سات کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ موجودہ دیگر زبانوں کے اخبارات کی اشاعت ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ حالانکہ صرف ۵۵ فیصد روسیوں کی زبان روسی ہے مگر ملک کی ۷۶ فیصدی آبادی پر روسی زبان کا غلبہ ہے۔ ۲۳۰۳ رسالوں میں ۱۳۰۳ روسی میں ہیں گویا کہ یہ شائع ہونے والے رسالے ۷۰ فیصد بازار پر اثر رکھتے ہیں۔ (الجمعیۃ دہلی)

ہندوستانی ناول نگار کو اعزازی ڈگری

لیڈس۔ ہندوستان کے ناول نگار مسٹر آر۔ کے نرائن کو لیڈس یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈی۔ لٹ کی ڈگری آئندہ سال ۲۰ مئی کو دی جائے گی۔ لیڈس یونیورسٹی دولت مشترکہ ممالک کی ادبیات کے مطالعہ کا اہم مرکز ہے۔

کرامت علی کرامت

مومن کا ایک شعر

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے

مومن کے اس شعر پر میں نے جو تنقید کی تھی، اس پر ۸ر نومبر ۹۶ء کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر رفیق حسین صاحب کا تجزیہ نظر سے گذرا۔ موصوف نے اس شعر سے جو معانی نکالے ہیں وہ شاید ان الفاظ میں بہتر طریقے پر ظاہر ہو سکتے تھے:

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس کی طرح جل اٹھے گا گلِ شمعِ دروں

(دروں بمعنی دل آتش نے بھی استعمال کیا ہے مثلاً
کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش
دروں صاف دیا، پاک اعتقاد دیا)

لیکن مومن کو تو کسی صورت "شبستاں" کا قافیہ لانا تھا چاہے شمعِ شبستاں کا جو مفہوم شاعر کے ذہن میں تھا وہ قاری کے ذہن میں واضح طور پر منتقل ہو یا نہ ہو۔ چاہے کوئی اس سے مفہوم عاشق کی قبر کے اوپر جلتی ہوئی شمع سے لے یا مجازاً قبر کے اندر کی روشنی سے (یا کسی اور کے شبستاں میں جلتی ہوئی شمع سے) اگر ڈاکٹر رفیق حسین صاحب نے جو معنی لیا ہے اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہاں لفظ "ماہی" کو صرف غیر ضروری نہیں بلکہ گمراہ کن کہا جائے گا۔ کیونکہ "فلس" سے مراد بجائے خود مچھلی کے چھلکے ہیں اور لفظ "ماہی" سے ذہن خود بخود اس خاص زمین کے نیچے کی مچھلی کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جس پر قدیم روایت کے مطابق، اس دنیا کا وجود ہے۔ پہلے مصرع میں چونکہ دفن ہونے کا ذکر آیا ہے اس لیے شارحین کا ذہن اس خاص مچھلی جو زمین کے نیچے ہے کی طرف منعطف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ "شمعِ شبستاں" اس شمع کو کہتے ہیں جو رات کے وقت خلوت خانے میں جلائی جاتی ہے یعنی اس ترکیب کے ساتھ زمان و مکان دونوں کا تصور وابستہ ہے۔ عاشق کی قبر کا اندرونی حصہ تو دن اور رات ہر وقت سوزشِ عشق کے نور سے پر نور رہتا ہے، اس روشنی کو شمعِ شبستاں سے تعبیر کرنا کہاں تک مناسب ہے؟ اگر اس سے قبر کے اوپر رات کے وقت جلائی ہوئی شمع سے مراد لی جائے تو یہ امر میرے خیال میں بعید از حقیقت نہ ہوگا۔

مزار پر شمع جلنے کا ذکر آتے ہی میرے ذہن میں غالب کا یہ شعر آتا ہے:

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

جہاں غالب کے شعر سے چراغِ مزار کی بیکسی و بیچارگی ذہن میں آتی ہے، وہیں مومن کے اس شعر کے مطالعہ سے عاشق کے چراغِ مزار کی مدت کی جانب میرا ذہن منعطف ہوتا ہے کیونکہ فلس ماہی اگر گلِ شمعِ شبستاں کی شکل اختیار کریں گے تو یہ ایک نادر سماں ہوگا جسے پہلے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔

بہرکیف، مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ مومن کے ذہن میں کیا مفہوم تھا۔ بلکہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کو جن الفاظ کا جامہ پہنایا ہے وہ کس حد تک ابلاغ کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہاں اور ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے مصرع میں فعل "ہوں گے" کا فاعل کون ہے؟ "ماہی کے فلس" یا "گلِ شمعِ شبستاں"؟ ان دونوں تراکیب میں "ماہی کے فلس" کی ترکیب پہلے مستعمل ہوئی ہے اور جمع بھی ہے اور اس کے برعکس "گلِ شمعِ شبستاں" کی ترکیب سے لفظ "گل" کے جمع ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا اس لیے "ماہی کے فلس" کو ہی "ہوں گے" کا فاعل تصور کرنا زیادہ فطری ہے (حالانکہ ڈاکٹر رفیق حسین نے "گل" کو ہی فاعل تصور کیا ہے)۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ ماہی کے فلس کس طرح گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے اور اگر ہوں گے تو کیا فرائض انجام دیں گے؟ اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش میں مختلف طرح سے قیاس آرائیاں ہوئی ہیں۔ سید امتیاز احمد نے اس خلاء کو یوں پُر کیا ہے "ہماری سوختہ بختی کے اثر سے وہ مچھلی جو قدیم خیال کے موافق طبقۂ زمین کے نیچے بالائے آب ہے اور حامل زمین ہے اس طور پر کہ مچھلی گائے کو لیے ہوئے ہے اور گائے کے سینگ پر طبق زمین ہے جل جائے گی اور اس کے فلس گلِ شمعِ شبستاں کا کام دیں گے اور مچھلی کی چربی کی شمع بھی بنتی ہے۔

(نگار۔ مومن نمبر) مطلب یہ کہ اس مچھلی کی چربی سے جو شمع بنے گی وہ اہلِ جہاں کے شبستاں کو روشن کرے گی اور جلتے جلتے آخر وہ بھی گل ہو جائے گی۔ سید امتیاز احمد کا خیال ہے کہ یہاں بلند پروازی اور نازک خیالی اعتدال سے بڑھ جانے کی وجہ سے معمہ بن کر رہ گئی ہے۔ حامد حسن قادری اس شعر کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

"بہت مشہور مطلع ہے مگر اس سے زیادہ بعید مضمون مومن نے شاید نہیں پیدا کیا۔ ناسخ کی طرح آورد، تصنع، تکلف، زبردستی ہے اور مطلقاً کوئی مزہ نہ قرینہ .... جلے تن مومن جب خاک میں دفن ہوں گے تو ان کے تن بدن کی آگ سے زمین کے نیچے کی مچھلی کے سنے جل اٹھیں گے اور شمع کے گل معلوم ہونے لگیں گے۔"

نیاز فتح پوری جن کا نام مومن کے مداحوں میں سرِ فہرست آتا ہے، انھوں نے بھی اپنے انتخاب میں اس شعر کو جگہ نہیں دی ہے۔ جوش ملسیانی نے یہ رائے دیتے ہوئے کہ

"بے کار اور بے لطف تخیل کی مبالغہ آرائی میں مومن مرزا غالب کے قدم بہ قدم چلتا ہے"۔

مثال کے طور پر موٴمن کا زیرِ مطالعہ شعر پیش کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس شعر کی تشریح کے سلسلے میں اس قدر اختلافِ رائے کیوں پایا جاتا ہے؟ میں ڈاکٹر رفیق حسین صاحب سے متفق ہوں کہ یہ شعر بعید الفہم ہے۔ لیکن یہ بعید الفہمی کس وجہ سے ہے؟ شاعر کے کسی نادر، ماورائی تجربے کی وجہ سے یا صرف الفاظ کے بے جا انتخاب اور ان کے تقدم و تاخر کی وجہ سے؟ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف الفاظ کے غلط انتخاب اور ان کی نشست کی بے ترتیبی کا آوردہ ہے۔ ویسے میرا مصرع

"بلبل کی طرح جل اٹھے کاکلِ شمعِ درِ دل"

زیادہ واضح طور پر ڈاکٹر رفیق حسین کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں اختلافِ رائے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔ موٴمن اگر چاہتا تو میرے اس مصرع سے بھی بہتر طریقے پر اس خیال کو ادا کرسکتا۔ لیکن موٴمن کے سامنے تو قافیے کی مجبوری تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح مجلسی والی روایت سے نسبت جوڑ کر اپنے شعر میں دور از کار اور بعید از قیاس ذہنی پیکر پیش کرکے لوگوں کو حیرت میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس شعر میں کیفیتوں کے ابلاغ کے دوران کہیں کہیں جذبات کی اضافی فراوانی کا فقدان نظر آتا ہے جس سے متعلق تفصیلی بحث میں اپنے پہلے مضمون میں کرچکا ہوں۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس شعر میں قافیے کی پابندی نے شاعر کے اصلی جذبات کو شدت کے ساتھ ظاہر ہونے نہیں دیا بلکہ مرکزی جذبات کی سمت کو کسی اور طرف موڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کی ماورائی اصلیت اس شعر کے دوسرے مصرع کے تکلف کے درمیان کھو کے رہ گئی ہے۔ اگر پہلے مصرع کی طرح دوسرا مصرع بھی رواں ہوتا تو نہ ابلاغ میں رکاوٹ محسوس ہوتی اور نہ مختلف قارئین کے ذہن میں اس طرح مختلف قسم کے سوالیہ نشان پیدا ہوتے۔ بعض حضرات اس شعر میں ایہام یا ذو معنویت کے استعمال کو شعر کی خوبی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ طارمے کا قول کہ

"شعر کا حسن اور اس کی لذت یا بی عبارت ہے
اس مسرت سے جو ہمیں اس کے معنی کی تلاش میں
قدم قدم پر ہوتی ہے"

صداقت کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے۔ کیونکہ معانی کی تلاش میں ہمیں جو نشاط ملتا ہے وہ شعر کی مکمل کیفیت نہیں بلکہ اس کا صرف ایک جزو ہوتا ہے۔ اصل جمالیاتی نشاط تو تحت الشعور اور لاشعور کی عمیق تہوں سے شعور کی سطح تک ابھرتی اور ڈوبتی ہوئی پیچیدہ اور گوناگوں جذباتی کیفیات کی لہروں کی وسعت و پہنائی کے علاوہ ان کے باہمی اختلاط سے حاصل ہوتا ہے جو ایہام یا ذو معنویت کے بغیر بھی ممکن ہے۔ موٴمن کے اس شعر سے الگ الگ معانی ضرور نکلتے ہیں جن کے پس پردہ ہماری قیاسی عقل (SPECULATIVE INTELLECT) کی کارفرمائی ہوتی ہے، لیکن یہ معانی جن جذباتی کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں وہ نہ شدید ہیں اور نہ ان کے باہمی اختلاط سے سالم کلیت پیدا ہوتی ہے۔

اس تنقید سے میری مراد یقیناً موٴمن کی عظمت سے انکار نہیں (کیونکہ میں بھی موٴمن کا قدرداں ہوں) البتہ اپنے "نظریۂ اضافیات" کے استعمال سے میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ شعر کے لیے نازک خیالی، بلند پروازی اور معنی آفرینی اہم نہیں ہیں بلکہ کیفیات کے ابلاغ کے دوران جذبات کی اضافی فراوانی ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے میں پھر کہوں گا کہ شاعر کے پیچیدہ جذبات کے سادہ و ابتدائی عناصر کا مطالعہ کرتے ہوئے ابلاغ کے مختلف مدارج میں جذبات کی اضافی فراوانی کی تلاش ہی مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔"

غزلیں

علی عباس امید

آرزوئیں جو کبھی تھیں کبھی پھولوں کی طرح
وہ بھی اب ناچتی پھرتی ہیں بگولوں کی طرح

ملتوں وقت کی ناگن ہمیں ڈستی ہی رہتا
ہم نے ایک عمر بسر کی ہے ببولوں کی طرح

سعی کرو کہ جھک جائے اخوت کا چمن
غیر محکم ہے ہر اک سانس اصولوں کی طرح

خود قدم دوستی کو آجائے گی منزل یارو
شمع دل تیز رکھو اپنے اصولوں کی طرح

کچھ تو سیکھوا نے نگاران تمدن ہم سے
ہم نے کانٹوں کو بھی رکھا ہے پھولوں کی طرح

قہقہے امن سکوں پیار محبت خوشیاں
ہیں تو ذہنوں میں مگر صرف مقولوں کی طرح

جب نظر ڈالتا ہوں صفحۂ ہستی پہ امید
چند سائے نظر آتے ہیں ہیولوں کی طرح

بیکس کانپوری

منزل دل میں ہے جو صدا الم غم کا جلوس
کیوں نہ افسردہ شمن ہوں عزم کے شہر کے فانوس

فکر گلشن تو کجا ذکر نشیمن بھی نہیں
اتنے ہم ہو گئے صیاد قفس سے مانوس

انقلابات نے بدلی ہیں روایات کہن
کاش فرسودہ خیالات بدلتے ملبوس

ذکر احباب پہ اپنا ہے یہ عالم بیکس
پاؤں کو دیکھ کے شرماتا ہے جیسے طاؤس

خورد غوث پوری

نام ہمت چمن میں اچھالو
بجلیوں پر نشیمن بنالو

چاہتی ہے سحر نور لینا
اپنے چہرے سے گیسو ہٹالو

لطف سے پیار سے التجا سے
بھیڑیوں کو بھی انساں بنالو

ہم تو گزریں گے راہ وفا سے
جس قدر چاہو کانٹے بچھالو

فصل گل سے نہیں فائدہ جب
فصل گل پر بھی خاک ڈالو

علیم افسر غازی پوری

تیرے لیے شادابی کے سامان بہت ہیں
اے فصل جنوں اب کے گریبان بہت ہیں

لیلائے خرد ان کی ذرا راہبری کر
دیوانے ترے شہر سے انجان بہت ہیں

بے مائیگی عشق سے تو نے کیا آگاہ
اے چشم تغافل ترے احسان بہت ہیں

منزل سے حقیقت کی گزر جاؤ تو سمجھیں
خوابوں کی گزرگاہ تو آسان بہت ہیں

تنہا کہاں جاتے ہو ٹھہر جاؤ اے افسر
یادوں کی بھی بستیاں ویران بہت ہیں

اختر نظمی

ساحل پہ خاموش کھڑا ہوں
طوفاں کا رخ دیکھ رہا ہوں

دریا سے کیا پیاس بجھے گی
میں تو اک پیاسا صحرا ہوں

ہر محفل آباد ہے مجھ سے
ہر محفل میں میں تنہا ہوں

ساتھ تھے سب آغاز سفر میں
منزل تک تنہا پہنچا ہوں

وہ راہیں اب تک روشن ہیں
میں جن راہوں سے گزرا ہوں

دنیا مجھ کو خواب ہے نظمی
شاید میں کچھ جاگ رہا ہوں

سال نو

ندیم مراد آبادی

آپ کی خدمت عالی میں جناب والا
چاہتا ہوں کہ نئے سال کا تحفہ بھیجوں

گزرے سال و جواہر گل و شمس و قمر
سوچتا ہوں کہ اگر بھیجوں بھی تو کیا بھیجوں

زیب دیتا نہیں یہ مجھ کو کہ سال نو پر
اپنی محرومی تقدیر کی رت بھیجوں

ہیں کہ شاعر ہوں بجز شعروں کے کچھ پاس نہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ میں نظم تمنا بھیجوں

آپ کی دنیا میں ہر شے کی فراوانی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا بھیجوں

یہ نیا سال مبارک ہو وطن والوں کو
آپ کو ہم کو بہاروں کے چمن والوں کو

سال نو آیا ہے پھر لیکے نوید عشرت
جان و دل دے کے بڑھانا ہے وطن کی عزت

ہمت و جرأت پر شوق عطا کرتی ہے
نظم آزادی و جمہور کی شان و شوکت

کل بھی فن کار کو تھا اپنے مقدر کا گلہ
آج بھی اس کی نگاہوں میں نہیں ہے قیمت

پھر اخلاص و محبت کی جلائیں قندیل
سامنے ہیں موت کے ہے عام یہاں کی نفرت

حق بخشیں بڑوں سے ہستی کا ادا ہوتا ہے
لوگ جو کرتے ہیں مخلوق خدا کی خدمت

سال نو آیا ہے پھر فکر و نظر لایا ہے
اپنے دامن میں حسیں شام و سحر لایا ہے

تعمیر نو

احتشام اختر

موت کے اندھیرے میں اک دیا جلاتا ہوں
منہدم عمارت کو پھر سے میں بناتا ہوں
دل کے ان خرابوں کو پھر سے میں بساتا ہوں
زلزلے تو آتے ہیں زلزلے تو آئیں گے
پھر زمین کانپے گی پھر مکان اجڑیں گے
زلزلے مقدر ہیں وادیٔ محبت کا!
زلزلے تو آتے ہیں زلزلے تو آئیں گے

دھوپ

عبدالرحیم نشتر

مشرق کی فضاؤں میں
اک دھوپ چمکتی ہے
اک دھوپ سنہری سی
جو پھیلتی جاتی ہے
تاریک سویروں پر
یہ دھوپ ذرا پھیلے
مشرق کی فضاؤں میں
خوشبو سی بکھر جائے
ہر دیس منور ہو جائے

اصغر عباس

زبانِ گل سے حسنِ یار کی تفسیر

(گذشتہ سے پیوستہ)

سوم کفایت شعاری۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوئیں علی گڑھ میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہاں خرچ میں بھی کفایت ہوگی مدرسہ کا مکان جس کے لیے تین لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے اگر علی گڑھ میں اس کے واسطے تین لاکھ روپیہ درکار ہو تو الٰہ آباد میں چار لاکھ روپیہ میں بھی ویسا مکان نہ بنے گا اکثر چیزیں اور مزدوری اور مصالحہ یہاں سستا ملے گا اور تعمیر مکان کے خرچ کے علاوہ طلبہ و دیگر اشخاص متعلقہ مدرسہ کے خرچ میں بھی یہاں کفایت ہوگی نرخ تمام اشیاء ضروری کا علی گڑھ میں ہمیشہ ایک مناسب اور اوسط ارزانی کے ساتھ خیال کیا گیا ہے چہارم قرب سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ۔ یہ بات بھی قابل ذکر کرنے کے قابل ہے کہ علی گڑھ میں ایک مشہور سائنٹیفک سوسائٹی قائم ہے جس کا یہ منشاء ہے کہ مغربی علوم کو مشرقی زبانوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں پھیلایا جاوے اور جس میں ایک بہت اچھا ریڈنگ روم ہے جہاں مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں کے اخبار بکثرت آتے ہیں اور ایک بہت اچھا اخبار بھی سوسائٹی سے اردو انگریزی دونوں زبانوں میں نکلتا ہے اور ایک معقول کتب خانہ بھی اس میں بتدریج فراہم ہوتا جاتا ہے خصوصاً اردو زبان کی کتابیں وہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بکثرت جمع کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں بلکہ علمی آلات علم برق و علم ہوا و گیاس وغیرہ کے تجربوں کے متعلق اس میں ایک مناسب تعداد سے موجود ہیں جن کے وسیلہ سے بہت سے مفید اور دلچسپ لکچر دیے جا سکتے ہیں پس ہمارے مدرسہ کا ایسے انسٹی ٹیوشن کے پاس ہونا نہایت سودمند ہوگا اور جیسا اس انسٹی ٹیوٹ سے ہمارے مدرسہ کو نفع پہونچ سکتا ہے اس سے بہت زیادہ نفع غالباً مدرسہ سے سوسائٹی کو حاصل ہوگا۔

پنجم تہذیب الاخلاق۔ اور اس بات سے بھی ہم کو قطع نظر نہ کرنا چاہیے کہ تہذیب الاخلاق جو خاص مسلمانوں کی تہذیب کا اخبار ہے وہ بھی اسی علی گڑھ میں چھپتا ہے اور آئندہ بھی غالباً وہیں چھپے گا اور اس اخبار کو ہمارے مدرسۃ العلوم سے بہت بڑا تعلق ہوگا اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں میرے نزدیک انشاء اللہ ایک دن یہ اخبار ہمارے مدرسہ سے مستقل تعلق پیدا کرے گا اور مسلمانوں کا مدرسۃ العلوم اخبار کو بناوے گا اور ہمارے لائق لائق طالب علموں کے آرٹیکل اس میں چھپا کریں گے۔

ان وجوہات پر میں اپنے مضمون کو اب ختم کرتا ہوں اور انصاف پسند مسلمانوں سے جو یقیناً نہایت نیک دلی اور بہ غور نگاہ سے اس معاملہ پر غور فرماویں گے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے اس دعویٰ کی واجبیت کو تسلیم کریں گے۔

آخر میں الٰہ آباد کا تذکرہ کچھ تھوڑا سا ضرور ہے جس پر غالباً گورنمنٹ کے دارالقرار ہونے کی وجہ سے اکثر رائیں شاید مائل ہوں گی بلاشبہ وہ گورنمنٹ کا دارالقرار ہے اور وہاں حال میں ایک کالج بھی قائم ہوا ہے اور ایک عجائب خانہ بھی وہاں شاید ترقی پکڑے گا اور ہائی کورٹ کی وجہ سے اکثر شخص بیرونجات سے بھی وہاں آتے جاتے رہتے ہیں اور ہندوستانی وکلاء کا معزز طبقہ بھی وہاں موجود ہے ان ممالک کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کا بھی اب وہی صدر مقام ہے اور چھاپہ خانہ بھی وہاں متعدد ہیں بمبئی اور جبل پور کے ریلوے بھی وہاں آکر ملتی ہیں اور ایام حج بیت اللہ کے قرب میں بہت سے مسلمان حاجی بھی اس تمام ملک اور تمام پنجاب بلکہ اور دور دور علاقوں کے الٰہ آباد کو ہو کر آتے جاتے ہیں۔

لیکن الٰہ آباد کی یہ تمام کیفیتیں اور خاصیتیں جن میں سے اکثر لکھنے میں بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہیں اور الٰہ آباد کے جغرافیہ میں لکھنے کے واسطے زیادہ موزوں ہیں درحقیقت ہمارے مدرسہ کے مقاصد کی کامیابی سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں گورنمنٹ کے حکام جلیل القدر سے جو تعلق ہمارے مدرسہ کو ہونا چاہیے اس کے لیے اوائل گرما یا اواخر گرما میں نینی تال اور مسوری اور شملہ کا راستہ جو علی گڑھ ہو کر ہے کافی ہے کالج اور ڈائرکٹر سے اس لیے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے کہ وہاں کی تعلیم میں اور ہماری تعلیم کے طریقوں میں بہت سا کچھ اختلاف ہوگا اور حاجیوں کا ایام حج میں اہل مقدمات کا پیروی مقدمات کے لیے وہاں وارد ہونا اور شتابی اور فکر میں آنا جانا ہمارے مدرسہ کے لیے کچھ مفید نہیں ہے معزز طبقہ کے وکلاء کا یہ حال ہے کہ اس میں مسلمان وکلاء معدودے چند ہیں اور ان تمام خاصیتوں کے ساتھ جب الٰہ آباد کے موسم کی خرابی اور ایام گرما میں لو کی شدت اور گرمی کی حدت کا خیال کیا جاتا ہے تو جی کانپ جاتا ہے اور ایک لمحہ کے واسطے بھی اس مدرسہ کے لیے الٰہ آباد کا مقام بہتر نہیں معلوم ہوتا مرجع بھی الٰہ آباد کا کچھ عمدہ نہیں ہے اس کے اطراف میں اس کثرت سے مسلمان آباد نہیں ہیں جس کثرت سے علی گڑھ کے اطراف میں ہیں۔

گرمی کی شدت جو الٰہ آباد میں ہے آگرہ میں بھی اسی کے قریب قریب ہے اس لیے آگرہ کو بھی علی گڑھ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں غرضکہ میرے نزدیک علی گڑھ سے بہتر کوئی مقام مسلمانوں کے اس مدرسۃ العلوم کے واسطے خیال میں نہیں آسکتا۔ پس خدا کرے کہ یہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو اور وہاں اس کے مقاصد کو کامیابی اور ترقی نصیب ہو اور ہندوستان کے مسلمان اس کے

ذریعے سے پھر وہ عزت حاصل کریں جس کے وہ در اصل مستحق ہیں
اور پھر وہ معزز تاج اپنے سر پر رکھیں جس کو ان کے مورث بڑے
فخر کے ساتھ کسی وقت میں جواب تک ہم بھولے نہیں ہیں
زیب سر کرتے تھے۔ آمین ثم آمین

راقم خاکسار — از مقام علی گڑھ
مشتاق حسین عفی عنہ — ۲۲ جولائی ۱۸۷۳ء

۱۹ اگست ۱۸۷۳ء کے گزٹ میں اسی موضوع پر مولانا حالی اور ان کے ساتھ مولوی ضیاء الدین خاں اور مولوی سبحان بخش کا بھی خط شایع ہوا ہے اس خط کے پہلے تعارف کے طور پر ایڈیٹر انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے مولانا حالی کی بصیرت علمی، مولوی ضیاء الدین کے فضل و کمال اور مولوی سبحان بخش کی دور اندیشی نظر کی تعریف کی ہے اور مدرسۃ العلوم کے قیام کے سلسلہ میں ان بزرگوں کی رایوں کی تائید کی ہے۔ ذیل میں یہ خط دیا جاتا ہے۔

میرے مخدوم و مکرم ایڈیٹر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، سلامت

میری رائے جو ذیل میں مندرج ہے اور جس میں میرے ساتھ جناب مولوی خواجہ ضیاء الدین صاحب دہلوی اور جناب سبحان بخش صاحب شکارپوری متفق ہیں از راہ عنایت و کرم اپنے اخبار میں درج فرما کر ہم سب کو مرہون منت فرمایئے۔ ناتسلیم

میں کئی دن سے یہ ارادہ کر رہا تھا کہ شمال و مغرب کے شہروں میں سے جس شہر میں مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا میرے نزدیک مصلحت ہے اس کی اولویت کی وجوہ لکھ کر کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم اہل اسلام کی خدمت میں پیش کروں مگر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے اخبار مورخہ ۲۶ جولائی کو دیکھ کر مجھ کو سبکدوشی حاصل ہوگئی اب مجھ کو اس سے زیادہ لکھنے کی حاجت نہ رہی کہ جناب ایڈیٹر صاحب اور جناب مولوی مشتاق حسین صاحب نے اس باب میں جن وجوہ سے علی گڑھ کو اور شہروں پر ترجیح دی ہے ان میں سے اکثر ایسی کافی ہیں جن پر غور کرنے کے بعد اور کسی وجہ کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی خصوصاً یہ وجہ کہ اس مدرسے سے زیادہ تر ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے جو علوم قدیمہ پڑھے ہوئے ہیں اور علوم جدیدہ اور مغربی زبانوں سے ایسے بدکتے ہیں جیسے دیہات کے ڈھور ڈنگر اجلے کپڑوں والوں سے بدکتے ہیں پس جو تدبیریں ان کی ترغیب اور تسخیر کے لیے کی گئی ہیں انھیں میں سے ایک بڑی تدبیر یہ بھی ہے کہ یہ مدرسہ جہاں تک ہو سکے ان شہروں اور ان قصبوں کے قرب میں قائم کیا جائے جہاں علوم قدیمہ کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے اور علوم جدیدہ کا پرچھاواں تک ان پر نہیں پڑا میرے نزدیک اس قسم کی بستیاں یا تو لکھنؤ کے مضافات میں پائی جاتی ہیں جیسے خیر آباد، گوپامئو، کاکوری، سندیلہ، بہیال، بانسہ وغیرہ یا دلی اور رامپور کے قرب و جوار میں پائی جاتی ہیں جیسے سہارنپور، کاندھلہ، دیوبند، انبیٹھ، پانی پت، سونی پت، فرید آباد، خورجہ، شکارپور، مراد آباد، امروہہ، بدایوں، سہسوان وغیرہ لیکن اگر لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے قرب کا لحاظ کیا جائے تو شمال و مغرب کے شہروں میں اس کام کے لیے کانپور کے سوا کوئی جگہ خیال میں نہیں آتی اور کانپور فی حد ذاتہ ہرگز اس بات کی قابلیت نہیں رکھتا کہ یہ مدرسہ وہاں قائم کیا جائے قطع نظر اس کے کہ جو وجوہ علی گڑھ کی ترجیح کے بیان کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کانپور کے ساتھ مساعدت نہیں کرتیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو کانپور پر ہرگز جچنے نہیں دیتیں مگر چونکہ ہم کو امید نہیں ہے کہ کانپور پر اس قدر رائیں متفق ہوں جن کا مقابلہ کرنا ضرور ہو اس لیے ہم ان کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں دیکھتے پس دلی اور رامپور کے قرب کا لحاظ کرنا واجب ٹھہرا۔ اس غرض کے لیے شہر کی آب و ہوا پر لحاظ کرنا بھی ایک نہایت ضروری امر ہے خصوصاً ہم لوگوں کی نظر میں کہ آج کل ہیضہ و بخار کے موسم میں وارد لاہور ہیں۔ مجھ کو کبھی علی گڑھ میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر بلند شہر کے ضلع میں جتنی مشہور بستیاں ہیں ان سب کی آب و ہوا کو میں بسبب اپنی واقفیت کے بہ نسبت تمام دیکھے ہوئے شہروں کی آب و ہوا سے بہتر جانتا ہوں اور علی گڑھ بھی بسبب قرب کے آب و ہوا کے اعتبار سے ضلع بلند شہر ہی کے حکم میں ہے اس کے سوا وہاں کی آب و ہوا کی تعریف میں نے ایسے لوگوں سے بھی سنی ہے جن کا قول ایسے امور میں نہایت معتبر گنا جاتا ہے دلی اور آگرہ جو ہندوستان کے مشہور و ممتاز شہر ہیں اور جن کے دیکھنے کو لوگ دور دور سے آتے ہیں اور علی گڑھ کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا اور دونوں سے قریب تر ہونا یہ ایک دام ہے جو کہ نوعمر اور زندہ دل لڑکوں کو دور دور سے کھینچ کر اس امید پر لے آئے گا کہ ایام تعطیل میں آگرہ اور دلی کی خوب سیر کریں گے اور یہ بات نہ دلی میں حاصل ہو سکتی ہے نہ آگرہ میں آگرہ بھی ایک ایسا شہر ہے جس پر اس کام کے لیے بیشک نگاہ پڑتی ہے مگر آب و ہوا کی خوبی اور دلی و رامپور کا قرب اور تمام ریلوں کا مرکز ہونا علی گڑھ کو اس پر بھی ترجیح دیتا ہے اور آگرہ کا دلی وغیرہ سے دور ہونا اور وہاں کی آب و ہوا کا اچھا نہ ہونا اس کے سوا اس کی مرجوحیت کی ایک وہ وجہ ہے جس کو شاید بعض صاحب اس کی ترجیح کے بیان میں پیش کریں گے یعنی گورنمنٹ اور ہائی کورٹ اور صدر بورڈ وغیرہ جیسے بڑے محکموں کا اس شہر میں ہونا اگرچہ بادی النظر میں اس کے رجحان پر دلالت کرتا ہے مگر غور کرنے کے بعد بالکل اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے کیونکہ ایسے صدر مقامات میں

متوسط درجہ کی لیاقت والوں کے بھی معاش اور نوکری کی سبیلیں اکثر نکلتی رہتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علم بے دستگاہ اور پردیسی اور جویائے معاش بہت سے ہوں گے پس ان آباد کی حالت موجودہ اکثر طالب علموں کی ترقی روزمرہ دفتروں میں خلل انداز ہوگی اور پہلے اس سے کہ وہ ہاتھ پیر مار کر ساحل مقصود تک پہنچیں غالباً یہ لالچ ان کو بیچ ہی میں لے بیٹھے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب کے نزدیک مدرسۃ العلوم کا علی گڑھ میں قائم کرنا عین مصلحت ہے۔

راقم

خاکسار الطاف حسین عفی عنہ

اضعف العباد

خواجہ ضیاء الدین

احقر العباد سبحان بخش عفی عنہ

مدرسۃ العلوم کی تاسیس کے سلسلہ میں مختلف لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار گزٹ ہی میں نہیں بلکہ ملک کے دوسرے اخباروں میں بھی کر رہے تھے کہ ۲۶ اگست ۱۸۷۲ء کو جلسہ خزینۃ البضاعۃ کا اجلاس ہوا جس میں سر سید نے فرمایا کہ "زرچندہ جو مشروط بخرید جائداد ہے وہ بھی وصول ہونا شروع ہوگیا ہے اور روپیہ کو بے کار پڑا رکھنا مناسب نہیں ہے اور یہ بھی میری رائے ہے کہ اگر دیہات معافی ہاتھ آویں تو ان کا خریدنا بہ نسبت پرامیسری نوٹوں کے زیادہ مفید ہوگا کیونکہ ان دیہات سے منافع بہ نسبت پرامیسری نوٹوں کے زیادہ حاصل ہوگا پس ہم کو جائداد خریدنے کی فکر درپیش ہے لیکن جائداد کا خریدنا حتی المقدور اسی ضلع میں مناسب ہوگا جہاں کہ مدرسہ قائم ہو اور اگر اس خاص ضلع میں کوئی جائداد نہ ملے تو اس کے قریب کے ضلعوں میں خرید کرنی ہوگی اور اس لیے مقام مدرسہ کے تصفیہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے پس میں تحریک کرتا ہوں کہ ممبروں سے رائے پوچھی جاوے کہ کس ضلع میں قائم کرنا مناسب ہوگا تاکہ اس ضلع یا اس کے قرب و جوار کے ضلعوں میں جائداد خریدی جاوے...... مرزا محمد رحمت اللہ بیگ نے یہ بات کہی کہ صرف ایک دو حرفی خط متضمن طلب رائے ممبروں کے پاس بھیج دینا کافی نہ ہوگا بلکہ...... سکریٹری کو اجازت دی جاوے کہ اس باب میں وہ ایک کیفیت تحریر کریں کہ کس ضلع میں مدرسہ قائم ہونا مناسب ہوگا اور جس ضلع میں وہ اس کا مقام تجویز کریں اس کی وجوہ تحریر کرکے کمیٹی کے اجلاس میں پیش کریں اور ممبران شریک جلسہ اس پر بحث کرکے اپنی رائے ظاہر کریں اور وہ کیفیت اور مباحثہ اور رائے ممبران شریک جلسہ کی ان ممبروں کے پاس بھیجی جاوے جو شریک جلسہ نہ ہوں تاکہ وہ سب لوگ ان مباحثوں پر غور کرکے اپنی رائے دیں۔" چنانچہ مجلس خزینۃ البضاعۃ کے نویں اجلاس میں سر سید نے ذیل کی رپورٹ کمیٹی میں پیش کی۔

"وہ مباحثات جو اس باب میں اخباروں میں چھپے ان کو بھی میں نے بغور دیکھا اور اس تعطیل میں جن جن دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان سے بھی میں نے گفتگو کی اور بالآخر میری رپورٹ یہ ہے کہ علی گڑھ سے بہتر کوئی جگہ مدرسۃ العلوم کے مقرر کرنے کے لیے نہیں ہے۔

جس قسم کا مدرسۃ العلوم مقرر کرنا تجویز کیا گیا ہے اور جس سے یہ مقصد ہے کہ طالب علموں کے اخلاق درست ہوں اور ان کے خیالات پریشانی سے محفوظ رہیں اور جمعیت اور تسکین کی طرف مائل ہوں اور جذبات انسانی کو اعتدال پر لایا جاوے اور حسن معاشرت ان میں پیدا ہو اس قسم کے مدرسہ کے لیے ضرور ہے کہ وہ ایسے مقام پر مقرر کیا جاوے جو منجملہ شہرہائے کلاں کے نہ ہو جہاں بہت سی ترغیبیں ان مقاصد کے برخلاف موجود ہوتی ہیں اور نہ بہت چھوٹا گاؤں ہو جہاں اشیائے ضروری بھی بہ مشکل دستیاب ہوتی ہوں یہ صفات مطلوبہ نہایت خوبی کے ساتھ علی گڑھ میں موجود ہیں۔

اس کے بعد ہم کو اس مقام کی آب و ہوا کی خوبی پر خیال کرنا بھی نہایت ضروری ہے جہاں مدرسۃ العلوم کا مقرر کرنا تجویز ہو۔ کیونکہ ہمارے لڑکے وہاں رہیں گے وہیں کی آب و ہوا سے پرورش پاویں گے ان کی صحت و تندرستی اور نیز ان کے ذہن اور دل و دماغ کی قوت پر وہاں کی آب و ہوا کا بہت کچھ اثر ہوگا علی گڑھ اپنی آب و ہوا کی خوبی میں مشہور و معروف ہے اگر میں کہوں کہ تمام شمالی و مغربی اضلاع سے وہ آب و ہوا میں عمدہ ہے تو کچھ بے جا اور ناواجب نہ ہوگا میں نے اس باب میں جناب ڈاکٹر جیکسن صاحب بہادر ایم۔ ڈی سول سرجن علی گڑھ سے مشورہ کیا تھا اور جو رائے کہ انھوں نے نسبت علی گڑھ کی آب و ہوا کی خوبی و عمدگی کے دی ہے وہ میری اس رپورٹ کے ساتھ شامل ہے۔ اس کے بعد ہم کو اس بات پر خیال کرنا چاہیے کہ ہر گاہ بالفعل یہ ایک ہی مدرسہ اس قسم کا قائم ہوتا ہے (خدا کرے کہ آئندہ بیسیوں ایسے ہی مدرسے قائم ہوں) تو جہاں تک ممکن ہو ہم کو ایسی جگہ قائم کرنا چاہیے جو مسلمانوں کے لیے زیادہ تر مفید ہو اس لحاظ سے جو شخص کوئی جگہ تجویز کرے گا علی گڑھ ہی کو تجویز کرے گا۔ علی گڑھ دہلی اور اضلاع مشرقی پنجاب سے بہت دور نہیں ہے میرٹھ، سہارنپور، رڑکی وغیرہ ان اضلاع کو جو شمالی مغربی کونے پر واقع ہیں ریلوے کے سلسلہ سے اپنے ساتھ ملاتا ہے روہیلکھنڈ ریل جو خاص علی گڑھ میں آن کر ملی ہے اس کے ذریعہ سے یہ مقام اور بھی زیادہ مفید ہو گیا ہے۔ اور تمام روہیلکھنڈ کو اپنے میں ملا لیا ہے۔

جنوبی سمت جس میں آگرہ و متھرا و بھرت پور کے علاقے کی مسلمان سادات کی بستیاں اور علاقہ دھولپور و گوالیار ہے اس کے لیے بھی مناسب دوری پر واقع ہے۔ لکھنؤ اور اپنے مشرقی اضلاع کو بھی ریلوے کے سلسلہ سے جدا نہیں ہونے دیتا پس اس مدرسۃ العلوم کے مقرر کرنے کے لیے علی گڑھ سے زیادہ مناسب کوئی جگہ واقع میں نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم کو اس بات پر خیال کرنا ہے کہ اس مقام میں یا اس کے گرد و نواح میں کس قسم کے لوگ بستے ہیں جن سے ہم کو اس بات کی توقع کرنی چاہیے کہ وہ لوگ اور ان کی اولاد اس مدرسہ کی ہمیشہ معین و مددگار و سرپرست و پرسان حال رہیں گے اس خیال سے جب میں آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو چاروں طرف اندھیرا معلوم ہوتا ہے پھر جو کچھ تھوڑی بہت توقع پڑتی ہے تو علی گڑھ ہی کے نواح کے لوگوں سے پڑتی ہے۔ علی گڑھ اور اس کے گرد کے تمام قصبات مسلمانوں کی آبادی کے ہیں اور علی گڑھ میں اور بلند شہر میں جو بالکل اس سے ملا ہوا ہے تمام مسلمان رئیس بڑے بڑے تعلقہ دار و ذی مقدور ہیں اور بعض ان میں سے روشن ضمیر اور سمجھ دار اور مآل کار پر غور کرنے والے اور اپنی قوم کی خراب حالت پر افسوس کرنے والے بھی موجود ہیں (گو بعض کی طبیعتیں اس کے برخلاف بھی ہیں) اور ایک نہایت عمدہ ریاست پنڈراول کی اس کے قریب ہے جس کے رئیس شیعہ ہیں اور ان تمام لوگوں سے اور ان کی اولاد سے ان سے بھی زیادہ توقع ہے کہ یہ سب نہایت دل سے ہمیشہ اس مدرسہ کے حامی و سرپرست رہیں گے یہ خاص صفت جو میں نے علی گڑھ کی نسبت بیان کی (اور جس کو سب سے اعلیٰ اور مقدم سمجھنا چاہیے) ایسی نہایت مضبوطی اور تقویت سے کہہ سکتا ہوں کہ تمام اضلاع شمالی و مغرب میں کسی دوسری جگہ نہیں ہے پس ان وجوہات سے میں نے علی گڑھ کو دارالعلوم بنانے کے لیے عمدہ مقام تجویز کیا ہے۔

ممبران کمیٹی اس بات کو یقینی تسلیم کرتے ہوں گے کہ اس مدرسۃ العلوم کے لیے الہ آباد کا مقام تجویز کرنا کیا بہ نظر وہاں کی آب و ہوا کے اور کیا بلحاظ اس کے موقع کے کہ زیادہ تر جانب مشرق واقع ہے اور کیا بہ نظر گرانی شہر کے جو روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے اور کیا بسبب اخراجات کثیر کے جو لوازمات روزمرہ کے سرانجام میں وہاں واقع ہوتے ہیں اور کیا بہ نظر اس بات کے کہ خاص اس مقام پر حال میں ایک مدرسہ اعظم گورنمنٹ کی جانب سے قائم ہوا ہے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

لکھنؤ بھی کیا بہ نظر آب و ہوا کے اور کیا اس سبب سے کہ ایک طرف کو پڑا ہے جو اور اضلاع کی نسبت بمنزلہ امریکہ کے ہے اس مدرسۃ العلوم کے لیے جو ابھی صرف ایک ہی قائم ہونا تجویز ہوا ہے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

آگرہ البتہ غور کے قابل تھا مگر اس کی آب و ہوا ہمیشہ سے بہت ناقص ہے اور انسان کے مزاج کو چنداں مناسب نہیں ہے جہانگیر بادشاہ نے اپنی تزک میں لکھا ہے "ہوائے آگرہ گرم و خشک است حکمای اطباء اند کہ روح را بہ تحلیل می برد و ضعف می آرد و بہ اکثر طبائع ناسازگار است مگر بلغمی و سوداوی مزاجاں را کہ از مضرت این اند ازیں جہت است کہ حیوانات کہ ایں مزاج و طبیعت دارند مثل فیل و گاو میش و غیر آں دریں آب و ہوا خوش میشوند" علاوہ اس کے موقع آگرہ بھی خوب نہیں ہے کیونکہ وہ جنوب کو زیادہ مائل ہے اور ان ملکوں سے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ایک طرف کو پڑتا ہے اور نیز ایک قدیم پورانا بڑا شہر ہے جو ہمارے اصول موضوعہ کے بموجب ایسا مدرسہ قائم ہونے کے لیے مناسب نہیں ہے۔

لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ یہ مدرسہ کسی نامی شہر میں ہونا چاہیے جس کے سبب سے مدرسہ اعلیٰ کا نام ہو اور شہرت پاوے مگر میں کہتا ہوں کہ خود یہ مدرسہ اس مقام کو جہاں یہ قائم ہوگا ایسا نامی کر دے گا کہ تمام ہندوستان کے مشہور و نامی شہر اس کے آگے پست ہو جاویں گے کیا آکسفورڈ اور کیمبرج کی چھوٹی سی آبادی تمام انگلینڈ کے نامی مقاموں سے زیادہ نامور نہیں ہے۔

ویران دلی میں (جہاں بجز چند دیوار ہائے شکستہ و بزرگان گور خوابیدہ کے اور کچھ نہیں ہے) مدرسۃ العلوم قائم کرنے پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر جو کمیٹی کو معلوم ہے کہ ابتدا ہی سے شمال و مغرب اضلاع ہی میں مدرسہ کے تقرر کے خیال سے کارروائی ہوئی ہے اور شمالی مغربی اضلاع ہی کی گورنمنٹ نے تمام امداد کا وعدہ کیا ہے تو ان مقاموں کی نسبت بحث کرنا جو حدود اضلاع شمال و مغرب سے خارج ہیں محض بے فائدہ ہے علاوہ اس کے بہت سے وجوہات ہیں جن کے سبب سے دلی اس مدرسۃ العلوم کے لیے مناسب بھی نہیں ہے۔

اب میں اپنی رپورٹ کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ علی گڑھ ایک پیارا نام ہے ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مشہور ہے کہ انا مدینۃ العلم و علی بابہا پس یہ پہلا مدرسہ ہم مسلمانوں کا جو درحقیقت علم کا دروازہ ہوگا علی گڑھ ہی میں ہونا چاہیے۔

دستخط

سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی

سکریٹری

------×۰×------

انجمن ترقی اردو پنجاب کا مطالبہ

چنڈی گڑھ۔ پنجاب میں اردو کو اس کا جائز مناسب مقام دیئے کا مطالبہ کیا گیا ہے یہ مطالبہ انجمن ترقی اردو پنجاب نے اپنے آج کے اجلاس میں کیا ہے اجلاس کی صدارت پنجاب کے وزیر زراعت جناب گیان سنگھ راڑیوالہ نے کی اس اجلاس میں ایک ریزولیوشن منظور کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ریاست کے ایڈمنسٹریشن کی نئی لسانی اور تعلیمی پالیسی وضع کرتے وقت اردو کو اس کا جائز اور مناسب مقام دیا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ تقسیم ہند سے قبل متحدہ پنجاب میں پورے پنجاب کی سرکاری زبان اردو تھی اور تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب میں بھی اردو ہی پنجاب کی سرکاری زبان رہی لیکن بعد کو جب ہندی اور پنجابی کا جھگڑا بڑھا تب اردو کو پنجاب سے دلیس نکالا دیا گیا۔

(الجمعیۃ)

لسانی فارمولا میں اردو کو شامل رکھا جائے

اور سنسکرت کو خارج کیا جائے

جناب احمد مکرم اعظمی، سکریٹری شعبۂ نشر و اشاعت، انجمن ترقی اردو بنارس نے سکریٹری محکمہ تعلیمات لکھنؤ کے نوٹیفکیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوٹیفکیشن نظروں سے گذرا، پڑھ کر بے حد تعجب اور از حد افسوس ہوا کہ ایسی ذمہ دار شخصیت کی جانب سے ایسا غیر منصفانہ دستخط و غلطیوں کا مجموعہ صوبائی اور مرکزی حکومت ہند کی پالیسی کے بھی خلاف کیونکر شائع کیا گیا، پھر ہم سے رائے بھی مانگی گئی ہے۔ (۱) مرکزی حکومت کا قطعی فیصلہ ہے کہ سہ لسانی فارمولا میں جدید زبانیں بنگلہ، اردو، مرہٹی، تامل، تیلگو وغیرہ پڑھائی جائے اور کلاسیکل زبانیں فارسی سنسکرت، اور عربی اس فارمولا سے خارج رہے۔ مگر اس نوٹیفکیشن کی دفعہ ۲ ضمن ۳ میں معاون مدرسین برائے مخصوص مضامین میں زراعت خیاطی، کتائی، بنائی، موسیقی کے ساتھ سنسکرت اور انگریزی دو ہی زبانوں کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ کس حق سے کلاسیکل لینگویج اور ڈیڈ لینگویج سنسکرت کا ذکر کیا گیا اور کس حق سے کسی دیگر ماڈرن زبانوں کا جس میں سب سے زیادہ اردو یو۔ پی میں بولی لکھی و پڑھی جاتی ہے کا کہیں ذکر نہیں۔ گویا ایک قلم بنگلہ و اردو وغیرہ کو ساقط کر دیا گیا ہے یہ سراسر خلاف انصاف ہے اور مرکزی حکومت کی پالیسی کے بھی قطعاً منافی ہے۔

(۲) پرائمری بیسک اسکولوں و جونیر ہائی (مڈل) اسکولوں میں جہاں درجہ اول سے درجہ آٹھ تک اردو سہ لسانی فارمولا میں پڑھائی جاری ہے۔ ان کے لیے اردو ماسٹروں کا اور ان کی لیاقت و قابلیت کا کوئی معیار یا کسی سند کا کہیں بھی ذکر نوٹیفکیشن مذکور میں نہیں ہے یہ کیوں کیا یہ مقصد ہے کہ اردو سرے سے کہیں پڑھائی نہ جائے اگر ایسا ہے تو یہ بالکل غلط ہے اور اگر یہ مقصد ہے کہ اردو کی تعلیم وہ ماسٹر دے جس کے پاس اردو کی کوئی کوالیفیکیشن اور سند نہ ہو تو یہ اول الذکر سے بھی زیادہ غلط ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے کم سے کم ۳ ۔ ۳ یعنی تین کروڑ چالیس لاکھ باشندگان ہند اردو بولتے ہیں، تقریباً ڈھائی کروڑ اردو والوں کے گلے پر اس طرح چھری چلائی گئی ہے۔

(۳) نوٹیفکیشن میں جے۔ ٹی۔ سی ٹریننگ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو حکومت نے کالعدم کر کے صرف بی۔ ٹی۔ سی ٹریننگ قائم رکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سکریٹری صاحب کو اپنے گھر کی بھی خبر نہیں ایسے نوٹیفکیشن سے کیا فائدہ۔

علاوہ بریں اردو کی اگر ٹریننگ کوئی نہیں تو حکومت یو۔ پی کے اردو کے منظور شدہ امتحانات مثلاً ایڈوانس اردو، ہندی ساہتیہ رتن ادیب کامل، ادیب ماہر وغیرہ الہ آباد و علی گڑھ کی ڈگریاں تو موجود ہیں جس کے پاس کرنے والے سیکڑوں کی تعداد میں یو۔ پی میں معلمین موجود ہیں انھیں سندوں کا اگر ذکر کر دیا جاتا تو معلمین کا کام ہو جاتا اور معلمین اردو کا نام بھی آجاتا۔ مگر انھیں دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ سراسر اردو کی حق تلفی ہے۔

(۴) ایجوکیشن کوڈ میں ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کے اردو معلمین کے لیے ایڈوانس اردو یا ادیب کامل کی لیاقت و سندوں کا ذکر ہے تو پھر اردو معلمین کے لیے ان سندوں کا ذکر نوٹیفکیشن مذکور میں کیوں نہیں کیا گیا ہے اس کمی کو فوراً پورا کیا جانا چاہیے علاوہ ازیں مندرجہ ذیل ترمیمات بھی ضروری ہیں۔

(الف) سہ لسانی فارمولا میں صرف جدید زبانیں اردو بنگلہ، سندھی، گجراتی وغیرہ کو شامل رکھا جائے اور کلاسیکل لینگویج فارسی عربی کی طرح سنسکرت کو بھی خارج کر دیا جائے۔

(ب) ہندی اور سنسکرت کے معلمین کی معیاری سندوں کے ذکر کے ساتھ اردو معلمین کے واسطے ایڈوانس اردو، ادیب ماہر، ادیب کامل الہ آباد و علی گڑھ کی ڈگریوں کا ذکر بھی کیا جائے۔

(ج) جس طرح حکومت نے بی۔ ٹی۔ سی ٹریننگ رکھی ہے اردو معلمین کے لیے بھی ایک ریفریشر کورس دو ماہ کی ٹریننگ کا یو۔ پی میں کم سے کم پانچ سنٹر کا انتظام کر دیا جائے تاکہ سال کے اندر اردو کے ٹرینڈ معلمین ہر ضلع پر ہیڈ کو مل سکیں۔

جب تک کہ یہ ترمیمات نوٹیفکیشن میں درج نہیں کی جائیں گی۔ ہم تمام اردو والے اس نوٹیفکیشن کو ناجائز و غلط تصور کریں گے اور بالآخر نوٹیفکیشن کے بائیکاٹ پر مجبور ہوں گے۔ (سیاست)

شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں

ڈاکٹر عابد حسین کی تقریر

گورکھپور .... مشہور مفکر اور دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین نے یہاں حال ہی میں یونیورسٹی کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور ہمیں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے ڈاکٹر صاحب نے ان حالات اور محرکات کا تفصیل سے

جائزہ لیا جنھوں نے ایک مشترکہ زبان کو جنم دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کی جڑیں ہماری تہذیب میں بہت گہری ہیں اور یہ جو اردو دشمنی کے بادل چھائے ہوئے ہیں وہ بہت جلد چھٹ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ زبان کے مسائل عقل سے حل کیے جاتے ہیں جذبات سے نہیں اور اب ہمارے ملک میں ایسی فضا پیدا ہو رہی ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کا مسئلہ بھی عقل کی بنیاد پر حل کر سکیں۔

جلسے کے شروع میں ڈاکٹر محمود الہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا تعارف کرایا اور خیر مقدم کیا۔ جلسہ کا اختتام غلام رسول مکرانی صاحب کے شکریہ پر ہوا۔

(اوصاف احمد انصاری)

ادارہ مصنفین نو کی تقریب میں سجاد ظہیر، سردار جعفری اور ساحر کی تقاریر

حیدرآباد۔ ۔ ۔ ۔ جشن مخدوم کے سلسلہ میں حیدرآباد آئے ہوئے مہمان فنکار سجاد ظہیر، سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی کے اعزاز میں کل ادارہ مصنفین نو کی جانب سے ایک خیر مقدمی جلسہ اعظم پورہ ریڈنگ ہال میں منعقد کیا گیا۔ حکیم یوسف حسین خاں کی تحریک پر ممتاز شاعر مخدوم محی الدین نے صدارت کی۔ ساجد اعظم نے خیر مقدمی تقریر میں ان سربرآوردہ شاعروں کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ رؤف خلش نے ادارے کا تعارف کرانے کے علاوہ کہا کہ ادارہ مصنفین نو کے تمام اراکین "انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کو مستحسن اور بروقت اقدام سمجھتے ہیں اور محترم سجاد ظہیر کی دعوت پر انجمن میں اپنی شمولیت کا یقین دلاتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے نوجوان فنکاروں کی صلاحیتوں اور ادبی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہر بڑے کام کی ابتدا عموماً بہت چھوٹے پیمانہ پر ہی ہوتی ہے چنانچہ ترقی پسند مصنفین" کی پہلی کل ہند کانفرنس میں جو ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی اس میں اردو کے صرف تین بزرگ منشی پریم چند، مولانا حسرت موہانی اور چودھری محمد علی نے شریک ہو کر ہماری ابتدائی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی تھی اور حاضرین کی تعداد آج کے جلسہ سے تقریباً دگنی تھی۔ اس مثال کے ساتھ سجاد ظہیر نے نوجوان فنکاروں سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو کسی اعتبار سے کم مایہ یا غیر اہم نہ سمجھیں۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے کام یا ذمہ داریاں ختم ہو چکی ہیں یا آپ کا کام شروع ہو رہا ہے، بلکہ یہ سلسلہ جاری ہے جس میں ہم اور آپ برابر کے شریک ہیں۔ سردار جعفری نے ادارے کی کوآپریٹیو اساس پر کتابیں شائع کرنے کی اسکیم کو نئی نسل کی خود اعتمادی قرار دیا اور کہا کہ یہ اقدام نہ صرف ان کے لیے بلکہ خود ہمارے لیے اور ادب کے لیے سود مند ہے۔ مخدوم محی الدین نے کہا کہ ان نئے فنکاروں سے پچھلے تین چار برسوں میں ان کا جو ساتھ رہا ہے۔ اس عرصہ میں میں نے محسوس کیا کہ ان میں کافی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔

سکریٹری نشر و اشاعت ادارہ مصنفین نو

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں

مخطوطات شناسی کی ماہیت اور اہمیت پر تقریر

دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے زیر اہتمام پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے مخطوطات شناسی کی ماہیت اور اہمیت کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔

پروفیسر فاروقی نے اپنے مقالہ میں اردو رسم خط کا شجرۂ نسب پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو رسم خط فارسی کی کاربن کاپی نہیں ہے اس کی ایک علیحدہ حیثیت ہے جس میں ایرانی حسن کے ساتھ ہندستان کی تمام آوازوں کا احترام موجود ہے۔

آخر میں آپ نے تحقیق متن کے مسائل پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اردو میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم مخطوطات شناسی کی طرف سائنسی ڈھنگ سے متوجہ ہوں اور اس کے اصول و قواعد مرتب کریں۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اس کام کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مقالہ کے آخر میں سوالات ہوئے اور بحث میں پروفیسر سید بشیر الدین لائبریرین دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے حصہ لیا۔

(سید ظہیر الحسن ایم۔ اے سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی)

"پتھروں کا مغنی" کی رسم اجراء

علی گڑھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر وحید اختر کے پہلے مجموعہ کلام "پتھروں کا مغنی" کی رسم اجرا کا ایک جلسہ آج پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ہوا۔ یہ جلسہ ڈاکٹر منیب الرحمن، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر عشرت حسن انور اور شہریار کی طرف سے تھا۔ جلسہ کی ابتدا ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے مختصر مضمون سے ہوئی اس مضمون میں اعظمی صاحب نے جدید ادبی میلانات و رجحانات کے پس منظر میں وحید اختر کی انفرادیت کو نمایاں کیا اور بتایا کہ وحید اختر کی شاعری کے لب و لہجہ اور فکر کا تعین خوابوں نے نہیں بلکہ خوابوں کی شکست نے کیا ہے مجموعی طور پر ان کی شاعری جدید ذہن کے احساس و فکر کی نمائندہ ہے۔ اعظمی صاحب کے مضمون کے بعد شعبہ نفسیات کے استاد معز علی بیگ نے وحید اختر کی طویل نظم "صحرائے سکوت" کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔ بعد ازاں وحید اختر نے اپنے شعری نظریہ کو مختصراً بیان کیا اور اپنی ہاں غیر مطبوعہ نظمیں اور دو غزلیں سنائیں۔ نظریہ شعر کی وضاحت کرتے ہوئے وحید اختر نے کہا کہ میں زندگی اور شاعری کو الگ نہیں سمجھتا اس بات کو میں تفصیل سے اپنے مجموعہ کے دیباچہ میں بیان کر چکا ہوں۔ وحید اختر کی تقریر کے بعد صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے اس تقریب کا انعقاد کرنے والوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میں وحید اختر کو پچھلے چند سالوں سے جانتا ہوں

وہ ایک اچھے نقاد اور شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مخلص انسان بھی ہیں تمام علمی اور ادبی کاموں میں وہ جس طرح پیش پیش رہتے ہیں اور ہر اچھے ادبی منصوبے میں جس طرح تعاون کرتے رہے ہیں اس سے مجھے ہمیشہ خوشی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باشعور فنکار ہیں، وہ مغرب اور مشرق کے قدیم و جدید ادبی رجحانات اور فکری اور تہذیبی میلانات کا صحت مند عرفان رکھتے ہیں اور شاعری میں ان سے کام لینا جانتے ہیں۔

آگے چل کر سرور صاحب نے کہا کہ نئی شاعری اور پرانی شاعری میں جو بنیادی فرق ہے اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ نئی شاعری کسی فیشن، فارمولے یا میکانکی کا سہارا نہیں لیتی وہ زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھتی ہے کچھ پرانے شاعروں یا ادیبوں کا جو رویہ نئے شاعروں یا ادیبوں کے سلسلے میں ہے وہ اس عمر خاتون سے بہت کچھ ملتا ہے جو ہر نئی نویلی دلہن کو اپنی سوت سمجھتی ہے۔ میرے خیال میں یہ صحت مند رویہ نہیں ہے۔ شاعروں کے بیشتر سرمائے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے جذبات اور ذہنوں میں ہیجان ہے ان کے پاس احساس کی دولت ہے یہ مسائل کے بارے میں سوچتے ہیں یہ بعض چیزوں کی تخریب چاہتے ہیں، بعض چیزوں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ان میں تجسس پایا جاتا ہے بحیثیت مجموعی نئی شاعری کی یہ چیزیں اس استادی سے زیادہ قابل قدر ہیں جو ہنر تک محدود رہتی ہے۔ وحید اختر کی شاعری نئی شاعری کے اس پس منظر میں اور بھی قابل قدر معلوم ہوتی ہے انھوں نے اپنی جدیدیت کو کسی خاص صنف موضوع یا اسلوب میں محدود نہیں کر دیا ہے۔ بلکہ اپنی بات کو زیادہ بلیغ بنانے کے لیے موقع اور محل کا لحاظ رکھا ہے کہیں انھوں نے کلاسیکل شاعری کی مرصع زبان سے استفادہ کیا ہے اور کہیں بول چال کے آہنگ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

انھوں نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں اور پابند بھی اور غزل کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے بعض دوسرے شاعروں کی طرح غزل یا عورت اور ان کے اعصاب پر سوار نہیں ہے۔

مجھے امید ہے کہ علی گڑھ اپنے ذہن کا دریچہ ہر نئی لہر اور ہر تجربے کے لیے کھلا رکھے گا۔ تجربہ کرنے اور سوچنے میں جھجک نہ ہونا چاہیے۔ تشکیک سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تشکیک ہی کے بطن سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔ آج کا دور خاصا میکانکی ہے اس دور میں شاعری کا بھی ایک پیغام ہے لیکن یہ پیغام کی بلاغت اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب ہم فرد اور جماعت، حال اور ماضی، جدید اور قدیم کے ناگزیر لیکن نازک رشتوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے لگیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں شاعر کی بصیرت سے مدد ملے گی اور شاعری ہمیشہ نشہ اور نجات کا ذریعہ رہے گی۔

میں پھر وحید اختر کو مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں۔

سرور صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد ایک محفل سخن ہوئی جس میں شہریار، بشیر بدر، رویندر بھرمر، وارث کرمانی، زاہدہ زیدی، خلیل الرحمن اعظمی، مسعود علی ذوقی، عشرت حسن انور، ساجدہ زیدی، منیب الرحمن اور صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنا کلام سنایا۔ (نامہ نگار ہماری زبان)

بنیادی ادب کا کل ہند انعامی مقابلہ

بھارت سرکار کی جانب سے منعقد ہونے والے بنیادی ادب کے انعامی مقابلہ میں اجتماعی ترقی پروگرام اور امداد باہمی کے ذریعہ دیہات کی ترقی وغیرہ کے موضوعات پر کتابیں اور مسودے مانگے گئے ہیں ان میں بہترین کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے کے تیرہ انعام دئے جائیں گے اور ایک موضوع کے لیے ایک انعام ہوگا یہ کتابیں اور مسودہ چودہ زبانوں میں ہوں گے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن سخنور سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا